باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یومِ آزادیٔ پاکستان

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

یہ تاریخی کہانیاں نہیں۔ ان میں ہمیں تنبیہہ کی گئی ہے کہ تم بھی ویسی روش اختیار کرو گے تو تم بھی تباہ ہو جاؤ گے

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

پرویز

قرآن کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس نے کہا ہے کہ وَ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ۔ (۲۴/۳۴) ہم نے تمہاری طرف واضح قوانینِ زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بھی۔ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرنے سے مقصد کیا تھا، یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا، وہ نتیجہ ہوتا ہے ان قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا جن کے مطابق یہ عظیم کارگہ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی یونہی بلا اسباب رونما نہیں ہوجاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ زوال پذیر ہوکر رفتہ رفتہ تباہ ہوجاتی ہے۔ قرآن نے وہ قوانین بیان کئے ہیں جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے، اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے، اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہوگئیں اور فلاں قوم نے اس کی مخالفت کی تو وہ تباہ و برباد ہوگئی۔ اور اس کے بعد، وہ قومِ مخاطب اور آنے والی اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں تم خود فیصلہ کرلو کہ تم زندہ اور پائندہ رہنا چاہتے ہو یا تباہ و برباد ہونا۔ اگر زندہ و شاداب رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کرلو۔ جس قسم کی تمہاری روش ہوگی، اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ دیکھئے! وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں سامنے لاتا ہے جب کہتا ہے کہ

دیدۂ عبرت کشا!

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ۔ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہوگزری ہیں، اور انہوں نے اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ انکی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمتِ گزشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اسکے بعد

ان کی تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں ۔ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ ۔ وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں جو اب تمہاری مخاطب ہے اور قوت و حشمت میں بھی اس سے بڑھ کر۔ اُن کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے ۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۔ (۴۰/۸۲) لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی ۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آگئی تھی ۔ خدا نے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستے پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے ۔ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۔ (۴۰/۸۳) لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر فرحاں اور نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغامبرانِ انقلاب آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے، اس سے ہمارے ہاں مَن برس رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں ۔ آپ تشریف لے جائیے ۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں ۔ لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو اُن سے وہ آسمانی پیغام رساں کہتے تھے ۔ انہیں اُن تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے ۔ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ (۴۰/۸۴) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو کہا کہ ہم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور جس نظام کو اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے، اُسے مسترد کرتے ہیں ۔ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۔ لیکن جب تباہی سامنے آ کھڑی ہو تو اس وقت غلط روش سے اجتناب کچھ فائدہ نہیں دے سکتا ۔ پھر اس قوم کی ہلاکت اٹل ہوتی ہے ۔

یہ سنت اللہ ہے

یہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی جو صرف کسی ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی ۔ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۔ (۴۰/۸۵) یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری و ساری رہی ہے ۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲) ۔ اور تو خدا کی اس روش ، اس قانونِ محکم میں ، کبھی تبدیلی نہیں پائے گا ۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں ۔

اشتراکیت کا نظریۂ تاریخ

آگے بڑھنے سے پہلے ، ضمناً یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے دور میں ، ایک اور گوشے سے بھی تاریخ کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی ہے اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ ۔ اس کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ کی تفصیل طول طویل ہے لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے اور پروان چڑھتا ہے ۔ جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے ۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اس سے ماسبق نظام کا ہوا تھا ۔ انسان کی ساری تاریخ انہی تضادات کی باہمی کشمکش کی داستان ہے جسے جدلیت (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے تضادات کی یہ کشمکش اس قدر پُرقوت اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ انسان اس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے ۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ایسی قوت ہے جو اس قدر اٹل اور منہ زور واقع ہوئی

ہے تو اس نے کہا کہ اس قوت کا نام تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSIT) ہے۔ یہ اصطلاح ایسی مبہم بلکہ موہوم ہے کہ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ وہ شے ہے کیا جسے اس قدر مہیب اور لافانی قوت حاصل ہے کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا، نہ دے سکتا ہے۔
اصل یہ ہے کہ مارکس نے خدا اور اس کے قوانین کا انکار کیا تو اس سے اس کے تحت الشعور میں ایک خلا پیدا ہو گیا، لیکن، خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں۔ اس لئے اسے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کسی قوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اس کے لئے اس نے "تاریخی وجوب" کی ایک موہوم سی اصطلاح وضع کر لی اور اس طرح اپنے لاشعور کی خلا کو پُر کر لیا۔ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ کاروانِ انسانیت جن راستوں سے گزرا ہے "تاریخ" ان کے ریکارڈ کا نام ہے اور بس۔ اس ریکارڈ کو کون سی قوت حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ریکارڈ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ فلاں دور میں کس قسم کے ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے اور فلاں زمانے میں کس سسٹم کا معاشی نظام رائج کیا گیا، اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ تاریخ، بہرحال انسانی سعی و کاوش اور فکر و عمل کا ریکارڈ ہے اور ریکارڈ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔
اشتراکیت میں "تاریخ" کا ایک اور تصور بھی ہے جو اس سے بھی کہیں زیادہ گمراہ کن ہے۔ اسے کہتے ہیں "تاریخ کی مادی تعبیر" (THE MATERIALIST CONCEPT OF HISTORY) اس تصور کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں، ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی (یعنی مادی مفاد کا تصادم) تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات سب واہمہ ہیں۔ انگلز (ENGELS) اس باب میں لکھتا ہے:-

> تاریخ کے مادی تصور کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے ..... اس تصور کی رو سے، ہر تمدنی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل۔ اسکے بنیادی اور اصلی سبب کو، لوگوں کے دلوں کے اندر، یا خارجی حق و صداقت اور عدل و انصاف کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (یا نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔
>
> (ANTI DUHRING — P. 300)

جہاں تک آئیڈیالوجی (یا نظریۂ حیات) کا تعلق ہے، انگلز لکھتا ہے کہ:-

> (اس میں شبہ نہیں کہ) آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر، شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (FALSE CONSCIOUSNESS) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا عمل مبنی بر نظریہ کہلا ہی نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے۔
>
> (MARX — ENGELS CORRESPONDENCE, P. 510-511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی لڑائیاں یا تصادمات کہتے ہیں، وہ حق اور باطل کی لڑائیاں نہیں تھیں، وہ درحقیقت معاشی لڑائیاں تھیں۔ حق کی خاطر لڑنے والے مصلحین، حتّٰی کہ حضرات انبیاء کرام (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا تھے جو اسے حق و باطل کا تصادم

سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

یہ ہے اشتراکیت کا سب سے اہم نظریۂ تاریخ۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کا نظریۂ تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ مختلف نظریاتِ حیات کی کشمکش کا ریکارڈ ہے۔ جو نظریہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ان کے خلاف ہو، وہ شکست کھا جاتا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت قانون میں ہوتی ہے، قانون کی سرگذشت میں نہیں۔ اقوامِ سابقہ کی ان سرگزشتوں کو بھی قرآن نے داستان گوئی کے لئے بیان نہیں کیا۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے (یعنی ہر زمانے کی اقوام سے) یہ کہتا ہے کہ ان اقوامِ سابقہ کے انجام و عواقب کو سامنے رکھ کر، تم اپنے لئے آپ فیصلہ کر لو۔ جس قوم کی روش تم اختیار کرو گے اسی قوم جیسا انجام تمہارا ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم (حضرت) نوحؑ سے کیا ہے اور مختلف اقوام کی سرگزشتیں بیان کرتا، عہدِ نبی اکرمؐ تک پہنچ گیا ہے۔ ان سطور میں بتایا جائے گا کہ قرآن کریم نے وہ کون سے جرائم (یعنی غلط نظام) بتائے ہیں جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں کہ کیا ہم بھی قومی حیثیت سے انہی جرائم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

تمہیدی وضاحت

اس سلسلہ میں دو اہم امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ غلط روش پر چلنے والی قوم میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن قرآن کریم ان تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس میں سے صرف اس بنیادی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر کرتا ہے جو اس نظام کی اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی خرابیاں جس کے برگ و بار ہوتے ہیں۔ خدا کا رسول بھی سب سے زیادہ زور اُسی بنیادی خرابی کے ازالہ پر دیتا، اور اُسی کو اُن کی تباہی کا موجب بتاتا ہے۔ ان اقوام کی سرگزشت کے بعد جب ان بنیادی جرائم کی فہرست ہمارے سامنے آئے گی تو یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہو جائے گی کہ قومیں کس قسم کے جرائم یا غلط نظریاتِ زندگی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ اصل چیز نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ جرائم درحقیقت غلط نظریہ یا تخریبی نظام کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اور یہیں سے وہ دوسری بات ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تباہ ہونے والی قوم میں یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں خوبیاں یا اچھائیاں نہ ہوں۔ اس میں اچھے افراد بھی ہوتے ہیں لیکن غلط اجتماعی نظام کے تباہ کن نتائج کو ان کی انفرادی نیکیاں روک نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً" (۸/۲۵) اس فتنے سے بچتے رہو جو جب آتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم و جرائم کئے ہوں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند کو احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آجاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس تساہل یا تغافل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیاں تباہ کر کے رکھ دیا کرتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے ہاں نظام کس قسم کا رائج کرتی ہے۔ غلط نظام میں بسنے والے وہ افراد بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے جنہوں نے انفرادی طور پر کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اس سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اس نظام کو مسترد کر کے یا تو اس کی جگہ صحیح نظام قائم کریں، یا ان لوگوں سے الگ ہو کر، کسی ایسی جگہ چلے جائیں جو صحیح نظام کے قیام کے لئے سازگار ہو۔ اسے دین کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے جو قریب قریب ہر رسول کا شیوہ رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان اہم اقوام کی سرگزشتوں کی طرف آتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

———(۰)———

قومِ حضرت نوحؑ

قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کے سلسلہ کا آغاز قومِ نوح سے کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں، اس لئے وہ ان اقوام کے زمان و مکان کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مقصدِ پیشِ نظر تک محدود رکھتا ہے یعنی اس حقیقت تک کہ اس قوم نے اپنے ہاں معاشرہ کس قسم کا قائم کر رکھا تھا۔ اس معاشرہ کی نمایاں خرابیاں کیا تھیں اور اس کا انجام کیا ہوا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کے احوال و کوائف سے اُس کی اولین مخاطب (عرب) قوم اچھی طرح واقف تھی اور اسے کرنا بھی یہی چاہیئے تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ دیکھو! پارتھین قوم نے یہ کیا اور اس کا انجام یہ ہوا، تو قومِ مخاطب سب سے پہلے یہ سوال لے اٹھتی کہ پارتھین قوم کون تھی، کہاں تھی، ان کی تباہی کیسے ہوئی اور کیا معلوم یہ کچھ ہوا بھی یا نہیں۔ یہ سلسلۂ بحث و تحقیق شروع ہو جاتا اور اصل مقصد اسی الجھاؤ میں کھو جاتا۔ وہ جن اقوام کا ذکر کرتا ہے ان کی داستانیں، قومِ مخاطب (عربوں) کے ہاں عام تھیں اور ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات، ان کے گرد و پیش اور ان کی مسافرت کے راستوں میں بکھرے پڑے تھے۔ یعنی وہ اقوام جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ (۲۰/۱۲۸)، جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ ان اقوام کی سرگزشتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے فقط اتنا بتایا کہ ان کا یہ انجام کیوں ہوا۔ اور اگر تم بھی وہی کچھ کرو گے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

آغازِ داستانِ قومِ نوحؑ

کہا یہ جا رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قومِ نوحؑ کی سرگزشت سے کیا ہے۔ تاریخی قیاسات کا رُخ اس طرف ہے کہ یہ قوم دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بستی تھی اور ان کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح کا تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ قوم، زمانہ قبل از تاریخ کی دیگر اقوام اور قبائل کی طرح بُت پرست تھی۔ ہنوز تمدن کی اس سطح پر بھی نہیں پہنچی تھی جہاں اتنا بھی معلوم ہو کر سیلاب کی تباہی سے بچنے کے لئے کشتی بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی بتائی تھی۔ اور جب وہ لوگ انہیں کشتی بناتے دیکھتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو رسوم و رواج اور زندگی کے طور طریق انہیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملے تھے، انہیں بے حد مقدس سمجھتے اور ان پر شدت سے کاربند رہتے تھے۔ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی دلائل و براہین پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس قوم کی علمی، ذہنی اور تمدنی سطح تو یہ تھی لیکن معاشرہ میں طبقاتی

طبقاتی امتیازات

امتیازات بڑی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور یہی اُس معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی تھی جسے قرآن نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ قوم تباہ ہو گئی۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰)، تمام انسان بنیادی طور پر یکساں واجب التکریم ہیں۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار

کی رُو سے ہوگا، نہ کہ حسب نسب، پیشہ یا دولت کے معیار کے مطابق۔ یہ تھی وہ بنیادی قدر جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا۔ اور جس کی مخالفت، اور سخت مخالفت، اکابرینِ قوم کی طرف سے ہوئی۔

اس مقام پر ایک اور بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ہر رسول کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اس کے

مخالفت ملاءِ قوم کی طرف سے

انقلابی پیغام کی مخالفت، سب سے پہلے ملاءِ قوم نے کی۔ اس میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے الفاظ اس تکرار و اصرار سے آتے ہیں کہ ایک پارہ (نویں پارہ) کا عنوان ہی قَالَ الْمَلَاُ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "سردارانِ قوم"۔ عرفی اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح ہے۔ لیکن مادہ کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کے برتن ضروریاتِ زندگی کے سامان سے ہر وقت بھرے رہیں۔ یعنی قوم کا دولت مند، خوشحال طبقہ۔ انہی کو قرآن نے دیگر مقامات پر مترفین کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں جنہیں زندگی کی آسائشیں بافراط حاصل ہوں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی، قوم کے دولت مند، سرمایہ پرست طبقہ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور ان کی تائید و حمایت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ جو غلط نظریات اور مسالک تمہارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرو۔ تو فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ۔ تو اس قوم کے اکابرین نے جن کے ہاں دولت کی فراوانی تھی اور اس وجہ سے انہوں نے صحیح مسلکِ زندگی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، اس سے کہا کہ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ۔ (۱۱/۲۷) تم ہمیں کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ ہم دیکھ یہ رہے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے نہایت پست درجہ کے، کمینے اور رذیل لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نہ انہیں عقل ہے نہ فکر۔ اس لئے وہ بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں اور تم اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہو کہ تمہاری دعوت حق و صداقت پر مبنی اور تمہاری پکار بڑی جاذب ہے۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔ (۲۳/۲۵) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷) ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو ہمارے مقابلہ میں کونسی فضیلت حاصل ہے جو ہم اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے سوچو اور سمجھو۔ اسے دیکھو اور پرکھو کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھو کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کا پیشہ کیا ہے۔ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (۲۶/۱۱۲) میری نگاہ ان کی سیرت و کردار پر ہے۔ اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ جس معاشرہ کی تشکیل کی میں دعوت دیتا ہوں اس میں معیارِ تکریم و تعظیم، کردار کی بلندی اور جوہرِ ذاتی کی گرانمایگی ہوتا ہے۔ نہ کہ حسب و نسب کی تفریق اور ذاتوں اور پیشوں کی تمیز۔ حسب و نسب کی تفریق انسانی انانیت کا خود ساختہ امتیاز ہے۔ اور پیشوں کا فرق، معاشرہ میں تقسیمِ کار کا فطری نتیجہ۔ لہٰذا ان امور کو شرفِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ اگر ایک محنت کش مزدور، کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ہے تو وہ اس صاحبِ ثروت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا کردار پست ہے۔

اس پر ان اکابرینِ قوم نے کہا۔ یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا۔ (۱۱/۳۲) اے نوح! ہم نے دیکھ لیا کہ تم بہت جھگڑالو واقعہ ہوئے ہو۔ تم نے بہت لمبی چوڑی باتیں کر لیں اور ہم نے سن لیں۔ اس بحث و تمحیص سے کچھ حاصل نہیں۔

ایک فیصلہ کن بات سن لو۔ وہ یہ کہ ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اس کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ قوم کے اشراف و اجلاف، رؤسا و غرباء، سرمایہ دار اور محنت کش، ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں؟ اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے ان منکرین سے کہا کہ تمہارا مطالبہ یکسر باطل اور بے ہودہ ہے۔ دعوتِ خداوندی کی رُو سے انسانوں کی وجہِ جامعیت واخوت ایمان ہے۔ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ (۱۱/۲۹) میں تمہاری خاطر، ان لوگوں کو جو اس کی دعوت کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں، دھتکار نہیں سکتا۔ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ (۱۱/۳۰) اگر میں انہیں دھتکار دوں، تو تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے، لیکن یہ بتاؤ کہ اس جرمِ عظیم کی پاداش سے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مجھے ملے گی، مجھے کون بچا سکے گا؟ اگر میں نے ایسا کیا تو إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (۱۱/۳۱)۔ تو میں بھی انہی لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو غریبوں اور مفلسوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ! تم اگر اس کے لئے آمادہ نہیں ہو تو اسے اچھی طرح سن رکھو کہ ہم تمہاری ان حرکتوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ان ادنیٰ اور رذیل لوگوں کو سر پر چڑھا کر، طبقاتی امتیازات کو مٹانے کا خیال عام کر رہے ہو۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ ... لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (۲۶/۱۱۶) اگر تم اس فتنہ پردازی سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے خلاف پراپیگنڈا کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں مذہبی پیشوائیت ان کا مؤثر ترین آلۂ کار تھی۔ وجہِ مخالفت تو وہ تھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے، لیکن مذہبی پیشوائیت ہر فتنہ کو مذہب کا رنگ دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈگڈگی بجانی شروع کر دی کہ تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (۱۴/۱۰)۔ لوگو! دیکھو! یہ نیا فتنہ اٹھا ہے۔ یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے منحرف کرانا چاہتا ہے۔ یہ ان معبودوں کی مخالفت کرتا ہے جنہیں تمہارے آباء و اجداد پوجتے چلے آتے ہیں۔ امیر اور غریب کا فرق خدا کا پیدا کردہ ہے۔ معزز اور ذلیل کی تفریق پیدائشی ہے۔ یہ ان امتیازات کو مٹا کر مساوات کی غیر فطری دعوت دیتا ہے۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے۔ یہ بالکل انوکھی بات ہے۔ مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۲۳/۲۴)۔ ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے، تم اٹھو اور اس فتنہ کا سر کچل کر رکھ دو۔

یہ تھا وہ مقام جہاں حضرت نوحؑ نے (قرآنِ کریم کے الفاظ میں) اپنے رب کو پکارا اور کہا تھا کہ اس قوم کے سعادت مند افراد نے حق و صداقت کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے باقیماندہ افراد میں اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا انہیں تباہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل بڑی وقیع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر معاشرہ کی یہ خرابی ابھی موجودہ انداز تک محدود ہوتی تو اسے برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو نسل ان سے آگے چلے گی وہ بھی انہی نظریات کی حامل اور اسی انداز معاشرت کی علمبردار ہوگی۔ اس طرح یہ وجہِ تفریقِ انسانیت اندازِ معاشرہ نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھتا چلا جائے گا اور یہ روش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس لئے رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ (۷۱/۲۶) بار الٰہا! ان لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دے۔ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ (۷۱/۲۷) اگر ان لوگوں کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی آنے والی نسل بھی، جو انہی کی گود میں

پروان چڑھے گی، انہی نظریات کی حامل ہوگی۔

معیارِ قومیت

یہ تھا وہ جرمِ عظیم جس کی پاداش میں وہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان تباہ ہونے والوں میں خود حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن ایک اور نکتہ سامنے لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ قوم سرکش تو غرق ہو جائے گی لیکن میں "تیرے اہل" (یعنی تیرے اپنوں کو) بچالوں گا۔ جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ ان کا بیٹا بھی غرق ہونے والوں کے زمرے میں شامل ہے تو انہوں نے کہا کہ بارِ الٰہا! تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو میرے اہل کو بچا لے گا۔ تو بیٹے سے بڑھ کر اہل کون ہو سکتا ہے۔ اسے کیوں نہیں بچایا جاتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ اے نوحؑ! یہ تیری بھول ہے جو تو اس لڑکے کو محض اس بنا پر کہ اس کے ساتھ تیرا خون کا رشتہ ہے، اپنے اہل میں سے سمجھتا ہے۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ یہ یگانہ نہیں، بیگانہ ہے۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶)، اس کے اعمال و کردار معیارِ خداوندی کے مطابق نہیں۔

یہاں قرآن نے، اپنے اور بیگانے کا ایسا بنیادی اصول بیان کر دیا ہے، جو اسلامی نظریۂ قومیت کی اساس قرار پا گیا یعنی (حضرت) نوح کا بیٹا، خون، رنگ، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود اپنوں میں سے قرار نہ پایا۔ اپنوں میں سے وہی سمجھے گئے جو ایمان کے رشتے میں مشترک تھے۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی بھی چونکہ ایمان میں شریک نہ تھی اس لئے وہ بھی غیر قرار دے دی گئی۔

قرآنِ کریم نے اپنے بلند، عالمگیر، غیر متبدل اصولوں کی صداقت کے لئے جس قوم کی سرگزشت سے آغازِ داستان کیا، اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ

(۱) جس قوم میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہوں، جہاں اشراف اور رذائل کی تفریق پیدائش کی رُو سے کی جائے، جس میں عزت کا معیار دولت ہو، جس میں عام پیشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے، جس میں رؤسا اسے برداشت نہ کر سکیں کہ مفلس اور غریب ان کے برابر بیٹھ جائیں ـــــ

(۲) جس قوم کا مسلک یہ ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے، اس پر غور و فکر کرنا کفر و الحاد ہے، اور

(۳) جس قوم میں معیارِ قومیت، رنگ، نسل، خون، وطن، زبان کا اشتراک ہو نہ کہ ایمان کا رشتہ۔

وہ قوم آخر الامر تباہ ہو کر رہتی ہے ـــــ اب آگے بڑھیے۔

(ج)

لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اور اہم بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھیے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، ایک رسول جس قوم کی طرف آتا تھا اس میں ہر قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں لیکن ان میں ایک خرابی اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اس رسول کا مقصد صرف اس ایک خرابی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس معاشرہ کو تمام خرابیوں سے پاک اور صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی خارجی علاج تجویز، یا میکانکی طریق کار اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ اس قوم کو اصولی تعلیم دیتا تھا جس سے ان کا اندازِ نگاہ بدل جائے اور اس طرح ان کا معاشرہ ان خرابیوں سے پاک ہو جائے۔ یہ اصولی تعلیم کیا تھی؟ قرآن نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر رسول، اپنی قوم کو یہی دعوت دیتا تھا۔ وہ دعوت کیا تھی! يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ۔ (۷/۵۹)، اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت، محکومی، فرماں پذیری اختیار کرو۔ لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱/۲)، اس کے سوا کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت نہ کرو۔ یہ تھا ان کی ساری خرابیوں کا علاج، مع اس بنیادی خرابی کے جس کی طرف وہ

ان کی توجہ خاص طور پر مبذول کراتا تھا۔ یاد رکھیے۔ قرآن کریم چھیپ کا علاج ہر آبلہ پر پھایا رکھنے سے نہیں کرتا۔ اس سے مرض کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علامات مرض کے بجائے علتِ مرض کا ازالہ کرتا ہے اور جب علت کا ازالہ ہو جاتا ہے تو علامات خود بخود مفقود ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، تمدنی، حتیٰ کہ انفرادی خرابیاں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ وہ برگ و بار ہوتی ہیں غلط نظامِ زندگی کا۔ لہٰذا، ان کا علاج بھی الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ اس غلط نظام کی جگہ صحیح نظام (جو وحیِ خداوندی پر مبنی ہو) نافذ کر دینے سے ہو سکتا ہے۔ یہی خدا کا تجویز کردہ علاج ہے اور یہی آسمانی انقلاب لانے والے حضرات انبیاء کرام کا طریق کار تھا۔ اسی طریق کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

بہرحال، ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کے ابدی اصول کے مطابق، طبقاتی تفریق معاشرہ کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ ضمناً قرآن نے تاریخی سرگزشتوں کے سلسلہ کی ابتداء اس سے کی ہے، اور یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی میں بھی اسے دہرایا گیا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرمؐ کی قوم (قریش) کے سرداروں نے بھی بعینہٖ یہی اعتراض کیا اور انہیں بھی بعینہٖ یہی جواب دیا گیا۔

لیکن یہاں قرآن نے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بتایا کہ اس امتیاز سے تباہی کیوں آتی ہے۔ فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (۶/۵۳) یعنی یہ طبقات ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے فتنہ اور مصیبت کا موجب بنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن تک یہ بات تو ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی کہ بالادست طبقہ کس طرح زیر دست طبقہ کے لئے مصیبتوں کا موجب ہوتا ہے۔ وہ ان پر کیسے کیسے ظلم و ستم کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی تھی کہ زیر دست طبقہ بھی بالادست طبقہ کے لئے فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس زمانہ میں سامنے آئی ہے اور اب لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ طبقاتی امتیاز، نہ صرف زیر دست طبقہ کے لئے باعثِ مصیبت ہے بلکہ یہ خود بالادست طبقہ کے لئے بھی فتنہ کا موجب ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔

یہ تھی داستانِ قوم نوحؑ۔ اب آگے بڑھیے۔

(۰)

قوم عاد

قوم نوحؑ کے بعد، قرآن کریم، قوم عاد کی سرگزشت سامنے لاتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف یمن سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر، مصر و شام تک حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس قوم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے جس سے وہ (یوں سمجھئے گویا) موجودہ زمانے کی مغربی اقوام کے مماثل نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ قوت و حشمت اور مرفہ الحالی اور فارغ البالی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام پر سرفراز تھی۔ قرآن کریم نے زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً (۷/۶۹) کہہ کر ان کی مادی وسعتوں اور توانائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وَ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ (۸۹/۸) کے اضافہ سے یہ بتایا ہے کہ اس کی ہمعصر اقوام میں کوئی اس کے ہمسر نہیں تھی۔ انہیں انعام و بنین اور جنات و عیون کی بخشائشیں بافراط حاصل تھیں (۲۶/۱۳۳-۱۳۴) یعنی مال مویشی کی بھی کثرت اور یہ جتھہ بھی بہت وسیع۔ لہلہاتے باغات اور

سرسبز و شاداب کھیتیاں بھی بکثرت اور چشموں کا آبِ مصفا بھی رواں دواں۔ یہی اُس زمانے کی دولت اور قوت تھی جو اُس قوم کو اس فراوانی سے حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً (۴۶/۲۶)
انہیں سمع و بصر کی قوتیں بھی حاصل تھیں اور قلب و دماغ کی صلاحیتیں بھی۔ یعنی اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق، اشیائے فطرت کو مسخر کرنے اور ان سے مفید مطلب نتائج اخذ کرنے کی صلاحیتیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۔ (۲۹/۳۸) وہ جاہل اور بے بصر قوم نہیں تھی، دانا و بینا تھی۔ علم و ہنر سے بہرہ یاب تھی۔ ان کی تمدنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶/۱۲۹) وہ ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ حکومت کرنی ہے۔ یہاں تک کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ (۲۶/۱۲۸) وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں تعمیر کرتی تھیں۔ ضمناً، یہاں قرآن کریم نے ایک لفظ کے اضافہ سے ان کی یادگاروں پر ایسی گہری تنقید کی ہے جس کی زد انہی کی یادگاروں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی ہے جس کا اطلاق ہر زمانے اور ہر قوم کی یادگاروں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایسی یادگاریں بناتے تھے جن کا افادی پہلو کوئی نہیں تھا۔ اس سے محض ان کی انانیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً بڑے بڑے اونچے مینار یا محکم سنگین اور فولادی چٹانیں، جن پر صرف تو اتنا زیادہ ہو لیکن قوم یا انسانیت کو ان سے فائدہ کچھ نہ پہنچے۔ یعنی محض خود نمائی کی خاطر عبث و بے کار اسراف!

قرآن کریم نے اس قوم کے جرائم کی تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن اس نے جو کچھ اجمالاً کہا ہے اس میں ساری تفاصیل سمٹ کر آگئی ہیں۔

قومِ المجرمین

اس نے کہا ہے کہ وہ قوم المجرمین تھی۔ عربی زبان میں جرم کہتے ہیں کسی کے درخت کا پھل کاٹ کر اور توڑ کر اپنے ہاں لے آنا۔ بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ آپ دیکھئے کہ اس ایک لفظ میں اس قوم کے نظام کا پورے کا پورا نقشہ کس طرح نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں سلب و نہب، استحصال (EXPLOITATION) و استعمار، معمول ہو جس میں دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہر ممکن حربہ سے لوٹ لیا جاسکے۔ جس میں کیفیت یہ ہو کہ:

> دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد   اُمتے بر اُمتے دیگر چرد

محنت کوئی کرے، اس کا حاصل کوئی اور لے جائے اور وہ بھی اس طرح کہ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ۔ (۲۶/۱۳۰)
وہ کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ ان کی گرفت اس قدر محکم ہوتی تھی کہ کوئی اس سے دستگاری حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے حکمران جَبَّارٍ عَنِيْدٍ تھے۔ (۱۱/۵۹)
بڑے ظالم اور جابر، بڑے سرکش اور متکبر۔ دوسری جگہ ہے۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱/۱۵)، انہوں نے ناحق ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی اور نخوت اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ دھڑلے سے کہتے تھے کہ ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جو اس کی جرأت کرے ہم اس کی آنکھ نکال دیں گے۔ ہماری قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ جو ہمارے راستے میں آئے گا ہم اسے کچل کر رکھ دیں گے۔

یہ تھی وہ قوم جس کے ہاتھوں مظلوم و مقہور انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ ہوچکا تھا۔ جب ان کے مظالم انتہا تک

حضرت ہودؑ

پہنچ گئے تو ان کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے۔ تاکہ انہیں اس روش سے باز رکھا جاسکے۔ انہوں نے آکر ان سے کہا کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اسے چھوڑ کر قوانینِ خداوندی

کا اتباع کرو۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ (۶۶) اس قوم کے اکابرین نے کہا۔ دیکھئے یہاں بھی وہی لفظ اَلْمَلَاُ آیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست بھرپور حاصل تھا۔ انہوں نے نشۂ قوت میں بدمست ہو کر کہا کہ میاں (معاذ اللہ) ہوش کے ناخن لو۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ نظام جس کا نتیجہ دولت و حشمت اور قوت و شوکت کی اس قدر فراوانیاں ہیں، کبھی تباہی اور بربادی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ۔ ان پر جذبات اس قدر غالب آ چکے تھے کہ انہیں کوئی شے اپنے اصلی رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ انہیں اپنا سیاہ نامۂ اعمال بھی نہایت درخشندہ اور مزین نظر آتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب ذہنیت ایسی ہو جاتی ہے تو پھر کسی ناصح کی نصیحت کو کون سنتا ہے؟ انہوں نے حضرت ہودؑ کی نصیحت و موعظت سے اعراض برتا، تکذیب کی، سرکشی پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ تباہی تھا۔ اس تباہی کا نقشہ قرآن کریم نے بڑے عبرت انگیز انداز میں کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ اے قوم مخاطب! تم جو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر اترا رہے ہو گوشِ ہوش سے سنو کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ۔ ہم نے انہیں ایسا تمکن و تسلط عطا کیا تھا، وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو تمہیں بھی حاصل نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ لوگ جاہل تھے اس لئے اپنی جہالت کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً۔ انہیں دیکھنے سننے کی صلاحیت اور سمجھنے سوچنے کی اہلیت عطا کی تھی۔ وہ دیدہ ور اور باشعور تھے، صاحبِ علم و ہنر تھے۔ لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، مستقل اقدارِ سماوی سے اعراض برتا، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کیا تو ان کا علم و ہنر کسی کام نہ آیا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سب بیکار ثابت ہوئیں۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (۴۶/۲۶)۔ اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہلاک ہو گئے۔ انہیں ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے کوئی چیز نہ بچا سکی۔ اور یہ بات کچھ انہیں سے مخصوص نہیں۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ۔ (۴۶/۲۵)۔ ہر مجرم قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ان کی ہنرمندیاں انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تدبر کی فسوں کاری سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

قومِ عادؑ کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کی رو سے، وہ نظامِ زندگی جس میں دوسروں کی محنت کو لوٹا کھسوٹا جائے، جس میں کمزوروں اور ناتوانوں کو ہدفِ جور و ستم بنایا جائے، جس میں سلب و نہب اور (EXPLOITATION) قومِ غالب کا شعار ہو، وہ نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ نظام بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی حامل قوم بھی تباہ و برباد۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے، یہ اس کا اٹل فیصلہ ہے۔

اب آگے چلئے:

قومِ ثمود

قدیم زمانے میں، حجاز سے جو شاہراہ شام کو جاتی تھی، اس پر، وادیٔ قریٰ میں، ایک نامور قوم آباد تھی جو تاریخ میں ثمود کے نام سے متعارف ہے۔ زمانہ ان کا قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال (ق۔م) کا بتایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق، اس قوم کو بھی بڑا تمکن حاصل تھا۔ (۷/۷۴) پُر فضا باغات، لہلہاتی کھیتیاں، صاف اور شفاف پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے، وہ میدانوں میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں میں محکم قلعے بناتے تھے۔ (۷/۷۴؛ ۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

قرآن کریم نے ان کا بنیادی جرم، اور ان کے نظام کی اساسی خرابی وہ بتائی ہے جسے خود ہمارے زمانے میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار گلہ بانی پر تھا۔ وہ مویشی پالتے اور ریوڑ چراتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گلہ بانی کے لئے وسیع و عریض چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی ضرورت لاینفک ہے اور یہ کچھ انہیں فراوانی سے حاصل تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ کہ وہ اس کے باوجود یُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۲۶/۱۵۲) ملک میں فساد برپا کرتے تھے۔ اس فساد کی تفصیل غور طلب ہے۔ سردارانِ قوم ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنی ذاتی ملکیت جتا کر انہیں اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور کمزور اور غریب لوگوں کے جانور بھوکے پیاسے رہتے..... ان کی طرف حضرت صالحؑ خدا کا یہ انقلابی پیغام لے کر آئے کہ یہ چراگاہیں

معیشتِ گلہ بانی

اور چشمے، ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مفت ملتے ہیں، اس لئے انہیں تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر دوسرے انسانوں اور ان کے مویشیوں کو رزق سے محروم کر دے۔ ظاہر ہے کہ اکابرینِ قوم اس انقلابی دعوت کو کیسے قبول کر لیتے؟ چنانچہ جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا اور جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا ہے، مظلوم اور نادار طبقے نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور سردارانِ قوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ (۷/۷۵) تکبر و نخوت کے نشہ میں مدہوش سردارانِ قوم ان لوگوں سے پوچھتے تھے جنہیں انہوں نے بے حد کمزور اور ناتواں بنا رکھا تھا اور جو حضرت صالحؑ کے ساتھ ہو گئے تھے کہ کیا تم واقعی دل سے یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا پیغمبر ہے۔ وہ جواب دیں کہتے کہ ہم اسی لئے اس کے ساتھ ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کا پیغام ہے، ورنہ یہ بھی تو تم ہی میں سے ایک تھا۔ یہ اس قسم کی دعوت لے کر کیوں اٹھتا؟ ادھر سے ہٹ کر وہ خود صالحؑ سے مخاطب ہوتے اور کہتے کہ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۔ (۲۶/۱۵۳) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ کوئی صاحب عقل و ہوش یہ کہہ سکتا ہے کہ ان زمینوں پر ہمارے حقوق مالکانہ سب ناجائز ہیں اور ان ناداروں کو جو اپنی روٹی تک کے لئے ہمارے محتاج ہیں، ان پر اسی طرح تصرف کا حق حاصل ہے جیسا ہمیں۔ اس سے تو معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ ہم اس کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ اُن سے کہتے کہ يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ ۔ (۱۱/۶۲) تو تو ہم میں سے بڑا عقلمند آدمی تھا، قبیلہ کا ممتاز رکن تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ خود اپنے ہاتھوں..... اپنے قبیلہ کی دولت و حشمت کو برباد کر دینے کی سوچ رہے ہو! لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغامبر انقلاب پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی دعوت پر جمے رہے اور دوسری طرف سے مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ اس مقام پر قرآن کریم

نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے دیکھا کہ اس معاشرہ میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں، اور بات دو چار دس کی نہیں، یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے تو سوچا کہ ان کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی! — سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم — اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ بیشک قوم میں یہ خرابیاں عام ہیں، لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی بات

قوم کے سرغنے فساد کی جڑ ہوتے ہیں

نہیں۔ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ۔ (۲۷/۴۸) مملکت کے مرکزی مقام میں صرف نو سرغنے (لیڈر) ہیں جو اس سارے فساد کی جڑ ہیں۔ وہی قوم کو صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کا بندوبست کر لو تو سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم دو لفظوں میں کتنی عظیم حقیقت کو بے نقاب کر گیا ہے۔ عوام نہیں بگڑتے، یہ چند خواص ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر ان میں بگاڑ پیدا کرتے اور انہیں فساد پر اکساتے رہتے ہیں!

بہرحال مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ ان نو سرغنوں نے تہیہ کر لیا کہ حضرت صالحؑ کے مکان پر ہلّہ بول کر انہیں اور ان کے اہل کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے وارثوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلا دیا جائے کہ ہمیں اس قتل کا کوئی علم نہیں (۲۷/۴۹-۵۰) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ سازش بھی ناکام رہ گئی اور حضرت صالحؑ نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ لوگ مجبوراً ان کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اب دیکھئے کہ اس مصالحت کی شرط کیا تھی۔

آپ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ یہ مویشی ہمارے ہیں اور یہ زمینیں بھی ہماری ہیں، اس لئے ہمارے مویشی ہماری زمینوں میں ہی مچکے چریں گے۔ اس کے مقابل میں وہ اُن لوگوں کے مویشی ہیں جن کی یہ زمینیں نہیں۔ اس لئے وہ ان زمینوں میں نہیں آ سکتے۔ یہ تمہاری بھول ہے اور اس کی بنیاد اس غلط نگہی پر ہے کہ تم نے جانوروں اور زمینوں کی نسبت انسانوں کی طرف کر رکھی ہے۔ اس لئے "میری اور تیری" کے پھیر میں پڑ گئے ہو۔ درحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ یہ جانور سب خدا کی مخلوق ہیں — تمہارے بھی اور ان دوسرے لوگوں کے بھی — اور زمین ساری خدا کی ہے جسے اس نے اپنی مخلوق کے لئے ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ لہٰذا چراگاہیں سب مویشیوں کے لئے کھلی رہنی چاہئیں۔

انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔ آپ نے کہا کہ بہت اچھا۔ لیکن یہ ایک عملی مسئلہ ہے اس لئے اس کا ثبوت بھی عملی ہونا چاہیئے۔ وہ عملی ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری۔ نہ زید کی ہے نہ عمر کی۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ زمینیں بھی اللہ کی ہیں۔ اگر تم نے اس اونٹنی کو آزاد چرنے چھوڑ دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ کے پابند ہو۔ اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے منحرف ہو گئے ہو۔ قرآن کریم کے الفاظ میں — هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ..... (۷/۷۳)۔ یہ

خدا کی زمین خدا کی مخلوق کیلئے

ناقۃ اللہ ہے اور وہ ارض اللہ — ناقۃ اللہ، ارض اللہ میں چرتی پھرے گی۔ اللہ اللہ خیر سلّا — آپ غور کیجئے، قرآن کریم نے ان چار الفاظ میں، اس اقتصادی مسئلہ کا حل کس جامعیت سے پیش کر دیا ہے جو تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ وجہِ نزاع و فساد رہا ہے اور اب تک ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ذرائع رزق پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انہیں تمام مخلوق کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ حضرت صالحؑ نے، اپنے پیشِ نظر خاص واقعہ کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے جضور

نبی اکرمؐ نے اسے عالمگیر اصول قرار دینے کی جہت سے فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

زمین بھی خدا کی اور بندے بھی خدا کے۔ اس لئے خدا کی زمین، خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

سرداران قوم ثمود نے کہنے کو تو یہ معاہدہ کر لیا لیکن وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ وہ، اور قوم کا غریب طبقہ ایک سطح پر آ جائیں۔ وہ جوشِ غضب میں پاگلوں کی طرح اُٹھے اور اس اونٹنی کو جو ان کے معاہدہ کی محسوس نشانی تھی، ہلاک کر دیا اور اپنے اسی سابقہ نظام پر قائم ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے باطل نظام کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

تباہی قرآن کریم نے اس تباہی کا نقشہ دو لفظوں میں اس طرح کھینچا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت کی ساری تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا۔ خدا نے اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بنا پر، ان پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہو گئی[1]۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا۔ (۹۱/۱۱-۱۵) خدا کا قانونِ مکافات جب ظالموں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کانپا کرتا۔ قانون کی محکمیت کا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ عواقب سے نہ ڈرے۔ عواقب سے ڈرنا مصلحت کوشی ہے اور مصلحت کوشی اور عدل، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس کے بعد وہ رسولِ اللہ کی قوم مخاطب سے کہتا ہے۔ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا۔ یہ ان کے گھر تمہارے سامنے موجود ہیں، ویران، خالی، اُجڑے ہوئے۔ یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ (۲۷/۵۲) قوم ثمود کی اس سرگزشت میں، اربابِ علم و بصیرت کے لئے، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی روشن دلیل ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ

جو قوم، خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق کو انسانوں کی ذاتی ملکیت قرار دیدے، وہ کبھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتی۔ اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہو گا۔

اسی سلسلہ میں قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا غلط نظام وہی قومیں

حیاتِ آخرت سے انکار اختیار اور رائج کرتی ہیں۔ جن کا نظریۂ حیات یہ ہو کہ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ۔ (۲۳/۳۷) زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت اور اعمالِ انسانی کا محاسبہ سب افسانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان کا نظریۂ زندگی یہ ہو جائے تو پھر وہ کون سی چیز ہے جو اسے سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ اور غصب و استحصال سے روک سکے۔ نظامِ سرمایہ داری اس تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یہ تصورِ حیات اس نظام کا لازمی نتیجہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ رسولؐ نے جب ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور دوسری طرف حیاتِ آخرت سے

---

[1] چونکہ معاشرہ میں ناہمواریاں زمین کی بنا پر پیدا کی گئی تھیں۔ اس لئے قرآن نے تباہی کا استعارہ بھی زمین ہی کی شکل میں بیان کیا ہے۔

انکار کیا تو علامہ اقبالؒ نے اسے وارننگ دی کہ یاد رکھو۔ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اس تصورِ حیات کیساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کی بنیاد ہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ عمارت اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

اے کہ می جوئی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے

تم جو ایک عالمگیر نظام کی آرزو لے کر اٹھے ہو کیا تم نے اس کے لئے کسی محکم بنیاد کو بھی تلاش کر لیا ہے۔

اب آگے بڑھیئے اور قومِ مدین کی طرف آ جایئے۔

(۰)

قومِ مدین

حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ یہ قوم حجاز کے شمال میں، شام سے متصل علاقے میں سکونت پذیر تھی۔ حضرت شعیبؑ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن کا زمانہ قریب ۱۴۰۰ (ق، م) قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق یہ قوم تجارت پیشہ تھی۔ اور اس شعبہ میں انہوں نے بڑی ترقی حاصل کر رکھی تھی۔ لیکن ہر سرمایہ پرست تجارت پیشہ قوم کی طرح ان کا انداز بھی یہ تھا کہ

سرمایہ پرستوں کا نظامِ تجارت

وہ "لیتے زیادہ تھے اور دیتے کم تھے"۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک طرف محنت کش کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیں اور دوسری طرف ہر حیلہ کاری اور فریب دہی سے گاہک کی جیب بھی کاٹ لی جائے۔ قومِ ثمود میں اگر نظامِ سرمایہ داری کا عفریت زمینداری کی شکل میں لگدکوب تھا، تو قومِ مدین میں، وہ سوداگری کے پیراہن میں پائے زن۔ یہ تھی وہ قوم جس کی طرف، آسمانی انقلاب کے پیامبر حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ قرآن کریم نے ان کے تذکار جلیلہ کا آغاز ایک عمیق، بصیرت افروز نکتہ سے کیا ہے۔

حضرت شعیبؑ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کی قوم نے سمجھا کہ یہ خدا پرست انسان، لوگوں کو الشور کی بھگتی اور پوجا پاٹ کی تلقین کرتا ہے، سو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے اسے اس کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے کاروباری معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگ گیا ہے۔ کبھی ان سے کہتا ہے کہ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ۔ دیکھو! اپنے ماپ اور تول کے پیمانے کم نہ رکھو۔ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ — ٹھیک ٹھیک ماپو۔ صحیح صحیح تولو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ (۱۱/۸۵) گاہک کو اس کی ادا کردہ قیمت کے مطابق چیز دو۔ نہ اس میں کمی کرو نہ ملاوٹ۔ اور کبھی ان سے کہتا ہے کہ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ۔ ایسا نہ کرو کہ مختلف شاہراہوں پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ بارڈروں پر جا کر سمگلنگ کرو۔ اَوْ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ (۷/۸۶)۔ اور جو دیانت دار انسان تمہیں اس روش سے روکے اسے ڈرانے دھمکانے لگ جاؤ۔ اور اس طرح معاشرے میں ناہمواریاں اور پیچیدگیاں پیدا کرتے چلے جاؤ۔ اس پر وہ لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت شعیبؑ سے کہنے لگے کہ تم نے ہم سے صلوٰۃ کی اجازت مانگی تھی اور ہم نے اس کی یہ سمجھ کر اجازت دے دی تھی کہ تم اگر اپنے طریق پر خدا کی پرستش کر لیا کرو تو اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

یہ صلوٰۃ کیسی ہے؟

لیکن يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ .... اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا

مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)۔ تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف میں لا سکیں۔ نماز کو معاشی نظام سے کیا واسطہ! نماز کا تعلق مذہب سے ہے، معاشیات کا تعلق امورِ دنیا سے ...... یہ تمہارا مذہب کس قسم کا ہے جس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ سیکولر نظامِ زندگی کا تصور کچھ عصرِ حاضر کی ایجاد نہیں۔ دین اور مذہب کا یہ فرق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اربابِ سیاست و معاشیات کو اس سے کچھ تعرض نہیں ہوتا کہ لوگ مذہبی عقائد کس قسم کے رکھتے ہیں۔ اور پرستش اور پوجا پاٹ کس طور طریق سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا ہے جس کی وہ پوری پوری آزادی دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ مذہب، دنیاوی معاملات میں بھی دخل اندازی کرے۔ (اسے دین کہتے ہیں) قومِ شعیبؑ کا تصورِ زندگی بھی سیکولر انداز کا تھا۔ اسی لئے وہ حضرت شعیبؑ کی اس دعوت پر متعجب اور معترض تھے جس کی بنیاد دین پر تھی۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ عام طور پر ممتاز گھرانوں کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے جب وہ اس روش کی مخالفت کرتے تھے جو خود ان کے اپنے گھرانے اور اسی جیسے دوسرے گھرانوں میں متوارث چلی آتی تھی، تو غیر تو ایک طرف، خود اپنوں کو بھی ان پر تعجب ہوتا تھا کہ یہ عجیب پاگل ہے جو اپنے گھر کی دولت و حشمت اور شرف و عزت سے ہاتھ دھو کر پڑ رہا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی ایک ذی اثر گھرانے کے فرد تھے۔ اسی لئے قوم کے اکابرین نے ان سے کہا کہ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۱۱/۹۱)۔ اگر ہمیں تمہارے خاندان اور برادری کا پاس نہ ہوتا تو ہم تمہیں کبھی کا سنگسار کر چکے ہوتے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ اَرَهْطِيٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۱۱/۹۲)، تم عجیب لوگ ہو جنہیں خدا کے قانونِ مکافات کا تو کچھ ڈر نہیں لیکن میری برادری کا پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

ادھر سے ہٹ کر انہوں نے اُن لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا جنہوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ یہ غریب لوگ تھے اور ان کی برادریاں بھی طاقتور اور ذی اثر نہیں تھیں۔ ان اَلْمَلَاُ الْقَوْم نے ان سے کہا کہ تم اس انقلابی شخص کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے (۷/۹۰)، لیکن انہوں نے بھی ان کی ایک نہ مانی۔

بہرحال، انہوں نے اپنے نظام کو نہ بدلا تا آنکہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اس طرح ان کے اوپر آ کر گرا کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے اور ان کے گھر اس طرح اُجڑ گئے كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۱۱/۹۵) گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

یہ تھا انجام اس نظامِ معیشت کا جس میں تجارت، خون آشامی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تجارت کا تعلق شہری معیشت سے ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کی دیہاتی زندگی کا تعلق ہے، وہاں وہی زمینداری نظام رائج تھا جسے ہم قومِ ثمود کے ہاں دیکھ آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ہمارے سامنے نغمۂ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ میں آتی ہے۔

مدین کا پیاؤ

جب حضرت موسیٰؑ (زمانہ قبل از نبوت میں)، فرعون کے پنجۂ استبداد سے بچنے کی خاطر مصر سے بھاگے ہیں تو مدین کے علاقہ میں سرِ راہے ایک پیاؤ کے قریب آ کر، درختوں کے سایہ میں سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہ دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے پیاؤ پر اوروں کے مویشی پانی پی کر چلے جا رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جن کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے پیاؤ کی طرف دوڑ دوڑ کر جانا چاہتی ہیں لیکن وہ لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ سے نہ رہا گیا اور ان لڑکیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تم اپنی پیاسی بھیڑوں کو اس طرح روک کیوں رہی ہو؟ انہوں

نے کہا کہ ان مویشیوں کے چرواہے زور آور ہیں اور ہماری حالت یہ کہ گھر میں کوئی مرد نہیں بجز ایک باپ کے، جو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس لئے، جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر، چلے نہیں جاتے، ہم اپنی بھیڑوں کو کیسے آگے بڑھنے دے سکتی ہیں۔ یہ سن کر حضرت موسےٰ نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ ---- بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست۔ ---- ارضِ فرعون سے بھاگا تھا کہ وہاں کمزوروں اور غریبوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں۔ یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی کمزوروں اور بے کسوں کی وہی حالت ہے۔ یہ کہہ کر اٹھے۔ آگے بڑھ کر ان کی بھیڑوں کو پانی پلایا اور پھر درختوں کے نیچے آکر بیٹھ گئے اور بحضور رب العزت عرض کی کہ:-

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

یہ تھی قوم مدین کی دیہاتی زندگی، اور وہ تھی اُن کی شہری زندگی۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟

قومِ لُوط

اس وقت تک جن اقوام کی سرگزشت ہمارے سامنے آئی ہے وہ اپنے غلط سیاسی یا معاشی نظام کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسی قوم آتی ہے جس کا جرم خود ان کے نام کے اندر مضمر ہے۔ یہ ہے قوم لوطؑ جس کی نسبت سے لواطت کی نہایت مکروہ اصطلاح وجود میں آئی۔ ان کے مرکزی مقام کا نام سدوم تھا جسے انگریزی میں (SODOM) لکھتے ہیں۔ (SODOMY) کے لفظ کی نسبت اسی کی طرف ہے۔

قرآن کریم عصمت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کا شمار مستقل اقدار میں کرتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ عصمت خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوانوں میں اس کا تصور نہیں ہوتا۔ لہٰذا، جسے عصمت کا احساس نہ رہے وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب جنسی جذبہ کی تسکین بدنہادی (PERVERSION) تک پہنچ جائے تو وہ مقام "بَلْ هُمْ اَضَلّ" کا ہوتا ہے۔ یعنی حیوانوں سے بھی زیادہ پست سطح۔ کیونکہ حیوانوں میں (SEX-PERVERSION) نہیں ہوتی۔ یہ جرم انفرادی طور پر بھی کچھ کم شرمناک نہیں ہوتا لیکن جب یہ کسی معاشرہ کا عام معمول بن جائے تو اسے انسانی معاشرہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک جب قوم لوط کی سرگزشت ہمارے سامنے آتی تھی تو ہم حیران رہ جاتے تھے کہ وہ قوم، پوری کی پوری، اس قسم کی شنیع حرکت کی مرتکب کیسے ہو گئی۔ لیکن اب یہ بات چنداں وجہ حیرت نہیں رہی۔ قوم لوطؑ کی سرگزشت تو آج سے چار ہزار سال پہلے کے دورِ جہالت سے متعلق ہے۔ آج اس بیسویں صدی کے زمانۂ علم و بصیرت میں

دورِ حاضرہ کی حالت

دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن قوم، برطانیہ نے ...... وہ قانون پاس کیا ہے جس کی رُو سے لواطت (HOMO-SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے*۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ (۹۵/۴-۵) ہم نے تو انسان کو حسین ترین ہیئت میں پیدا کیا تھا۔ لیکن یہ کمبخت، اپنی حرکات سے اپنے آپ کو پست سے پست سطح پر لے جاتا ہے۔

---

* امریکہ سے بھی اس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ وہاں لڑکوں (غلام) کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

اس قوم کی بے حیائی اور سرکشی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت لوطؑ نے انہیں اس انسانیت سوز فعل سے باز رہنے کی تلقین کی تو بجائے اس کے کہ انہیں اس پر کچھ ندامت ہوتی، وہ آپس میں کہنے لگے کہ اَخْرِجُوْاهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۔ (۷/۸۲)، "یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا مقدس اور پاک باز سمجھتے ہیں۔ انہیں بستی سے نکال باہر کرو۔" اس پوری قوم کی طرف سے اس قسم کی باتیں سن کر حضرت لوطؑ حیرت زدہ رہ جاتے تھے اور انتہائی تعجب اور تاسف سے کہتے تھے کہ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۔ (۱۱/۷۸)، کیا تم میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو ذرا سوجھ بوجھ سے کام لے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس کے ہلاکت آفرین جراثیم سے قوم کا کوئی متنفس بھی محفوظ نہیں رہا تھا اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اس درجہ عام ہو جائیں تو اس کی تباہی میں کون سی کسر باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ قوم تباہ ہو گئی اور اس طرح تباہ ہوئی کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۔ (۱۱/۸۲)، اس کی بلندیاں پستیوں میں بدل گئیں۔ ...... بحرِ میّت (DEAD-SEA) کا مہیب اور لرزہ فگن ماحول اور اس میں بکھرے ہوئے کھنڈرات کی ویرانیاں، آج بھی اس سوختہ بخت قوم کے عبرت انگیز انجام کے مرثیہ خواں ہیں۔

اقوامِ مغرب کی عریاں اور آبرو باختہ تہذیب سے متاثر ذہنیتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا، قوموں کی موت و حیات سے کیا واسطہ! ان لوگوں کو وحی کی سند سے کچھ سمجھانا بے کار ہے۔ وہ اسے سند مانتے ہی نہیں۔ لیکن مغربی محققین کو تو یہ سند تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ان محققین سے پوچھ لیں کہ ان کی تحقیق اس باب میں کیا کہتی ہے۔ زیادہ نہیں تو وہ کیمبرج یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ڈاکٹر (J.D. UNWIN) کی کتاب (SEX & CULTURE) اٹھا کر دیکھ لیں جسے انہوں نے اسّی غیر مہذب قدیم قبائل اور سولہ مہذب اقوام کی جنسی زندگی کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۳۴۰)

اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں (ص ۳۴۳) لہٰذا جنسی ضوابط سے بیباک ہو جانے والا معاشرہ اگر سمجھتا ہے کہ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا تو اسے اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کا آخری نتیجہ قومی تباہی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ [1]

(۰)

قومِ فرعون

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کے جرائم کی فہرست طول طویل ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے انہیں تین اصولی اور

[1] اس کی تفصیل "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں ملے گی۔

انسانی شقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی استبداد ملوکیت کی قہرسامانیاں جن کا مجسمہ فرعون تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں جن کا پیکر ہامان تھا اور نظام سرمایہ داری کی خون آشامیاں جن کا نمائندہ قارون تھا۔ یہ تینوں یکجا، اور ان کے آہنی پنجے میں گرفتار قوم بنی اسرائیل کی شکل میں، تڑپتی، پھڑکتی انسانیت۔ دوسری طرف قرآن کریم نے ان تینوں گوشوں کے جرائم کا تذکرہ اس شرح و بسط سے کیا ہے کہ میری تصنیف "برقِ طور" کے قریب اڑھائی سو صفحات بمشکل انہیں اپنے دامن میں سمیٹ سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کو اس قدر مختصر وسعت میں سمیٹنا ناممکن ہے اس لئے ان کے سرسری تذکرہ پر اکتفا کیا جائے گا۔

پارٹی بازی

جیسا کہ نظام ملوکیت کا خاصا ہے، فرعون نے قوم بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا تھا اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔ وہ اس ڈر سے کہ بنی اسرائیل کہیں ایک مرکز پر جمع ہو کر اس کے لئے خطرہ کا موجب نہ بن جائیں، کرتا یہ تھا کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) ان میں پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو کمزور کرتا رہتا۔ پھر اس کی چال یہ بھی کہ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (۲۸/۴)، وہ اس قوم محکوم کے جن افراد میں جوہر مردانگی کے آثار دیکھتا، انہیں کچل دیتا اور ان سے عاری طبقے کو اپنا مقرب بناتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس نے رزق کے سب سرچشمے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے اس لئے یہ مظلوم و محکوم قوم نانِ شبینہ تک کے لئے اس کی محتاج تھی۔ اسی لئے اس نے جب ان میں ذرا سی سرکشی کے آثار دیکھے تو گرج کر کہا کہ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳/۵۱)۔ تم جانتے نہیں کہ یہ ملک میرا ہے۔ اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ میں تمہیں بھوکا مار دوں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴)۔ میں تمہارا پالنہار ہوں اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ تم پر حکومت کروں۔ جو جنہیں روٹی دیتا ہے وہی ان کا آقا اور خدا ہوتا ہے۔

اَن داتا

آپ دیکھتے ہیں کہ اس ذہنیت سے کس طرح تمرد و نخوت کے شعلے ابھرتے اور سرکشی اور انانیت کے طوفان اٹھتے ہیں۔

یہ تھا وہ فرعون جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کو یہ کہہ کر بھیجا گیا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)، فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ۔ (۲۳/۴۵-۴۶)۔ "جاؤ فرعون اور اس کے ارکین مملکت اور سرداران قوم کی طرف جو تکبر و نخوت کے پیکر ہیں"۔ قرآن کریم نے اس قوم کو کہیں مجرمین کہا ہے کہیں ظالمین۔ کہیں مفسدین کہا ہے کہیں فاسقین۔ یعنی ظلم و استبداد اور سرکشی و حدود فراموشی کے جس قدر جرائم ہو سکتے تھے۔ وہ سب ان میں موجود تھے۔

حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف آتے اور اس سے کہا کہ میں خدائے رب العالمین کا پیغامبر ہوں اور تم سے صرف اتنا مطالبہ کرنے کے لئے آیا ہوں کہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۱۷)، بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ دوسرے مقام پر جو الفاظ آئے ہیں وہ اس پیغمبرانہ مشن کی اور بھی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ (۴۴/۱۸)، کہ خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دے کہ میں انہیں خدا کی زمین میں لے جاؤں جہاں وہ خدا کے سوا کسی کے نہ ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہاں عباد اللہ کہہ کر ساری بات واضح کر دی۔ یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کو اپنے فیصلوں کا محکوم بنائے۔ انسان صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اپنے جیسے انسانوں

کا غلام بننے کے لئے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ کس قدر صاف، سیدھا اور مبنی برحق و انصاف تھا۔ انہوں نے نہ فرعون سے اسکی بادشاہت چھین لینے کا مطالبہ کیا تھا، نہ اس کی حکومت میں شریک ہونے کا دعویٰ۔ کہا صرف یہ تھا کہ اس مظلوم قوم کو اجازت دیدو کہ یہ کسی اور خطۂ زمین کی طرف چلی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایک قوم غالب اپنے ہاں کی اقلیت کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دے تو وہ پھر حکومت کس پر کرے؟ (ضمناً، یہ بعینہٖ وہی پوزیشن تھی جو تقسیم ہند سے پہلے ہمارے اور ہندوؤں میں بنائے نزاع تھی۔ ہندو بھی اسی لئے ہماری علیحدگی پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اگر مسلمان وہاں سے چلے گئے تو وہ حکومت کس پر کرے گا)

فرعون نے اس مطالبہ کی مخالفت کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوزیشن وہاں بڑی مؤثر اور حضرت موسیٰؑ کا مقام خاصا بلند تھا۔ اسی لئے فرعون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کی بجائے اس نے

احسانات کی یاددہانی

سیاستِ ملوکانہ سے کام نکالنا چاہا۔ اس نے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنے دیرینہ روابط کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم اس کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کا کیا جواب دیا۔ آپ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۲۲)۔ تم نے مجھ پر جو ذاتی احسانات کئے، ان کی یاد تو دلاتے ہو، لیکن اپنے اس سب سے بڑے "احسان" کی یاد کیوں نہیں دلاتے کہ تم نے پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو کہ مجھ پر ذاتی نوازشات کی قیمت میں بنی اسرائیل کی آزادی خرید لو۔

بَرو، ایں دام برمرغِ دگر نہ　　که عنقا را بلند است آشیانہ

جب وہ اپنے اس حربے میں ناکام رہا تو اس نے پھر وہ تدبیر اختیار کی جو حکمتِ فرعونی کا آخری حربہ ہوتی ہے۔ یعنی اس نے جھوٹے پراپیگنڈہ سے عوام کو برانگیختہ کرنا چاہا کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف ہنگامہ آرائیاں شروع کر دیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۔ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۔ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۲۶/۳۴-۳۵)۔ فرعون نے اپنے اراکینِ مملکت سے کہا کہ یہ شخص بہت بڑا فریب کار نظر آتا ہے۔ مطالبہ تو بظاہر یہ کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے لے جائے لیکن درحقیقت اس کا پلان یہ ہے کہ تمہیں اس مملکت سے نکال باہر کرے اور خود حکمران بن بیٹھے۔ کہو! اس فتنے کو فرو کرنے کے سلسلہ میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟

مذہبی پیشوائیت

اراکینِ مملکت نے کہا کہ اس کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کارگر نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے جذباتی مسئلہ بنا دیا جائے اور اسے مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ٹکرا کر عوام کو اشتعال دلایا جائے کہ یہ شخص اپنا مذہب تم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ فرعونؔ اور اس کے اراکین کے بجائے ہامانؔ اور اس کے جنود (مذہبی لشکروں) کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو (قرآن کے استعارے کے مطابق) رسیوں کے سانپ بنا بنا کر عوام کو فریب دیتے تھے۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ کیسا ہوتا ہے اور ان خدائی فوجداروں کے پیشِ نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ آتے تو ہیں اپنے مذہب کی حقانیت اور فوقیت ثابت کرنے کے لئے، لیکن بادشاہ سے پہلے معاملہ طے کرتے ہیں کہ ہم اگر کامیاب ہو گئے تو ہمیں ملے گا کیا؟ اور بادشاہ انہیں یہ لالچ دیتا ہے کہ ان کا شمار بادشاہ کے مقربین میں ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ قرآنِ کریم کے

بیان کے مطابق، وہ دل سے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰؑ کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے لیکن ان کا پندارِ نفس انہیں اس حقیقت کے اعتراف کی طرف آنے نہیں دیتا تھا۔ (۲۷/۱۴)

لیکن ان میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اعتراف کی جرأت کر لی اور اعلان کر دیا کہ موسیٰ کا دعویٰ سچا ہے اس پر جس طرح فرعون گرجا اور برسا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے لیکن (بغرضِ اختصار) اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو سامنے لایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون نے ان سے کہا کہ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۲۰/۷۱) تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی! اب دیکھو میں تمہارے کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں صلیب پر لٹکاتا ہوں۔ جس سے ظاہر ہے کہ استبداد ملوکیت، آزادیٔ خیال و عقاید کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں تبدیلیٔ عقیدہ (ارتداد) کی سزا موت ہوتی ہے۔

یہ تھا ملوکیت کے استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا گٹھ جوڑ۔ باقی رہا قارونؔ، سو اس کے متعلق قرآن کریم

قارون

نے کہا ہے کہ وہ خود قومِ موسیٰؑ میں سے تھا۔ یعنی بنی اسرائیل ایک طرف تو غیر قوم (قومِ فرعون) کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف، خود اپنے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ ان کا خون چوس رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس نظام میں دسیسہ کار ملوکیت، الجھ فریبی مذہبی پیشوائیت اور خون آشامی سرمایہ پرستی اس حد تک پہنچی ہو، وہ نظام، اس قوم کو لے کر ڈوبے گا نہیں تو اور کیا ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (۲۸/۶)، فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں نے اپنی آنکھوں سے اپنا وہ انجام دیکھ لیا جس سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور بنی اسرائیل نے آزادی کی فضا میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

(باقی آئندہ)

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

(قسط ۲)

پرویز

طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۸۲ء میں، اس نہایت اہم مقالہ کی قسط اوّل شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا بقایا حصّہ پیشِ خدمت ہے۔ اقوامِ سابقہ کی اس تاریخ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ قومیں یونہی ہنگامی طور پر زوال پذیر یا تباہ نہیں ہو جاتیں۔ ایسا خدا کے متعین کردہ قوانینِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوتا ہے۔ اور مقصد اس تذکرہ سے یہ ہوتا ہے کہ ہر قوم مخاطب اپنی حالت کا جائزہ لے لے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ قومِ فرعون تک کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔ اب آگے ملاحظہ فرمائیے۔

(٠)

قوم بنی اسرائیل

اور اب ہم اس قوم کی طرف آتے ہیں جسے فرعون کے مظالم سے رستگاری کے بعد آزادی کی نعمت سے نوازا گیا تھا قرآن کریم نے اس قوم کی داستان بڑی شرح وبسط سے بیان کی ہے اور ان کے تمام جرائم کو ایک ایک کرکے گنایا ہے جن کے نتیجہ میں وہ شوکت و حشمت کی اس قدر بلندیوں تک پہنچنے کے بعد اس طرح ذلیل وخوار ہوئی کہ دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن نے سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ چونکہ اس قوم کو یہ مملکت محض ان کے قائد (حضرت موسیٰؑ) کے دعویٰ کی صداقت اور بلندیٔ سیرت وکردار کی بنا پر بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی اس لئے اسے اس کی قدر ہی نہیں تھی۔ وہ (تورات کے الفاظ میں) قدم قدم پر حضرت موسیٰ سے جھلا جھلا کر کہتے تھے کہ "تو ہمیں کہاں مرنے کے لئے لے آیا ہے۔ ہم مصر میں بہت اچھے تھے۔ مصریوں کی ہانڈیاں پکاتے تھے اور پیٹ بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ ہم سے ہاتھ اٹھا کہ ہم پھر وہیں چلے جائیں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا، بیابان میں مرنے سے ہزار درجے بہتر ہوگا۔"

عدم گنجائش مانع ہے ورنہ تفصیل سے بتایا جاتا کہ بنی اسرائیل کی غلامی، غلامی کے بعد آزادی اور اس طرح مفت میں ملی ہوئی آزادی کے بعد ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت اور اس کے عبرت آموز مظاہر سے، کس طرح ہماری آزادی اور آزادی کے بعد ہماری

بنی اسرائیل اور ہم حالت کے ہوبہو عکس ہیں۔ اس داستان کو پڑھئے تو یوں نظر آتا ہے کہ مکان وزمان کی

تبدیلی کے ساتھ وہ گویا خود ہماری کہانی ہے۔

بہرحال، جب حضرت موسیٰؑ، ان کی اس قسم کی حرکتوں سے تنگ آ کر خدا سے فریاد کرتے کہ اس قسم کی قوم کا کیا کروں، تو انہیں جواب ملتا کہ یہ قوم غلامی کی فضا میں پرورش یافتہ ہے، اس لئے ان کی ذہنیت بدلتے ہی بدلے گی۔ تم ان کے بڑے بوڑھوں کو تو مرنے دو، لیکن ان کی آنے والی نسل کی پرورش اور تربیت اپنے زیرِ نگرانی کرو۔ چنانچہ حضرت موسےٰ نے ایسا ہی کیا، اور جب یہ نئی نسل پروان چڑھی تو اس نے مملکتِ خداداد کو مستحکم ہی نہیں بلکہ اسے سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی سے اس طرح ہمکنار کیا کہ ان کے عروج اور ترقی کی چمک دمک سے ایک عالم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں وہ خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جو دولت اور قوت کے غلط استعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں تو وہ اس طرح تباہ ہوئی کہ اسکی نظیر بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کی پہلی تباہی، بابل کے بادشاہ، بخت نصر کے ہاتھوں (قریب ۵۸۶ ق م میں) اس طرح ہوئی کہ اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور عام قتل و غارت گری کے بعد جو یہودی باقی بچے، انہیں ڈھور ڈنگر کی طرح ہانک کر بابل لے گیا۔ جہاں وہ قریب ایک سو سال تک غلامی کی بدترین مصیبتوں کا شکار رہے۔ لیکن انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقعہ دیا گیا اور ایران کے خداترس حکمران، سائرس (ذوالقرنین) نے، انہیں بابل کی غلامی سے رہائی دلا کر، دوبارہ یروشلم میں لا بسایا۔ اس کے بعد، انہیں پھر وہی خرابیاں عود کر آئیں تو آخری حجت کے طور پر، ان کی طرف حضرت عیسےٰؑ جیسا عظیم پیغامبرِ انقلاب مبعوث ہوا، لیکن انہوں نے جب ان کی دعوت کی مخالفت کی اور اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو ان کی آخری تباہی، رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں (۷۰ء میں)، اس طرح عمل میں آئی کہ وہ قریب دو ہزار سال تک خانماں خراب، بے گھر، بے در، زمانے کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ تا آنکہ اب انہیں مغربی طاقتوں کے تصدق، دھاندلی سے فلسطین میں رہنے کا ٹھکانہ ملا۔

خرابیوں کی فہرست جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن کریم نے ان کے جرائم کی فہرست بڑی تفصیل سے دی ہے لیکن بالغرضِ اختصار، یہاں ان میں سے صرف ان جرائم کو سامنے لایا جاتا ہے جو زیادہ نمایاں تھے۔ مثلاً:۔

(۱) ان کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۹/۳۴)

(۲) نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد، ربوٰ پر ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربوٰ کا چلن عام تھا حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (۴/۱۶۱)

(۳) ربوٰ کے علاوہ، وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (۴/۱۶۱)؛ (۹/۳۴) اس سلسلہ میں، ان کی ہوسِ زرپرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآن کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور ہے بھی یہ بھائی۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دیدو، تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سکتے بٹتے سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ کر مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ و خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دل نشیں انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے، اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو۔ اور

اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمہ دار تم خود ہو یاد رکھو تمہارے صدقہ و خیرات کے اس قسم کے کام اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے۔ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ۔ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۷۹)، اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ (۵/۶۳) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

(۶) ان کے اکابرینِ ملت (لیڈرانِ کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں جو وہ کر کے نہ دکھائیں لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ (۳/۱۸۸)

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء و مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا (۹/۳۱) کسی کو ان کے فیصلوں سے مجالِ سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی، اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ :-

ا۔ وہ غرور، نخوت، اور تکبر و تمرد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم و عقل کی بات کی جاتی تو وہ اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۲/۸۸)

ب۔ مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر جس قسم کا چاہو فتوے دے دیتے تھے (۹/۳۴)۔ اور پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۷۹)

ج۔ اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی طرف دعوت دے۔ (۹/۳۴)

د۔ وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی اور ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی (۴۲/۱۴) ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (۲/۱۱۳)

س۔ وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (۶۲/۵)

ص۔ وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو، جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے (۲/۸۰)۔ تم تو خدا کی چہیتی اولاد ہو۔ وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (۵/۱۸)

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں، مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون کی طرف سے گریز کی راہیں نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (۲/۶۵، ۷/۱۶۳)

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتی، اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی (۲/۹۶، ۲/۲۴۳) نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی

دیتا تو وہ بھیڑوں، بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مرجاتے۔ (۲/۲۴۳)

(۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے۔ جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۲/۲۴۷) اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے (۲/۲۴۹)

یہ تھی اس قوم کی حالت جب خدا کی آخری حجت اور بنی اسرائیل کا آخری پیغامبر حضرت عیسیٰؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے۔

حضرت عیسیٰؑ

حالت اس وقت یہ تھی کہ یروشلم پر حکومت تو رومیوں کی تھی لیکن بنی اسرائیل پر اقتدار مذہبی پیشواؤں کا تھا۔ یہی وجہ ہے جو آپ انجیل میں دیکھیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تلقین و توبیخ کا سارا رخ ہیکل کے انہی پجاریوں کی طرف تھا۔ ...... وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک حق گو پیامبرِ انقلاب کی طرح ان سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتلانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے ...... اے اندھے راہ بتلانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو ______ جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو ...... اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟
(متی باب ۲۳۔ آیات ۱-۲۶)

اور وہ کبھی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:

دیکھو! یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو ...... وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھی بنی اسرائیل کے علماء و مشائخ کی حالت، اور یہ تھا وہ مشن جسے لے کر حضرت مسیحؑ آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا جو خدا بنے بیٹھے تھے، اس تنقید کو کس طرح گوارا کر لیتے۔ انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہارے عقاید خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں

کی گئی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس میں لکھا ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سرداروں کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہو گی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پر مانگیں۔

آپ نے غور کیا، عزیزانِ من! کہ مسئلہ سارا معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جو کہا وہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکولر نظامِ حکومت سے خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق سیاسی امور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دین کے نظام میں مذہبی اور سیاسی دونوں دوائر، حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ بس اگر ہم نے غلطی کی تو بھی اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ص ۲۱۲)

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ مرتب کیا اور اس جرم کی پاداش میں ان کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ وہاں کے مروجہ قانون کی رُو سے ہیکل کے پجاری، موت سے کم ہر قسم کی سزا خود دے سکتے تھے۔ لیکن موت کی سزا کی توثیق حکومت سے کرانی پڑتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے رومیوں کے گورنر سے فتویٰ پر دستخط کرا لئے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ حضرت مسیحؑ کا نہیں بلکہ خود ان کے اپنے قتل کا محضرنامہ (DEATH WARRANT) ہے جس پر وہ دستخط کرا رہے ہیں۔ وہ قتل نامہ بھی پر قریب ستر سال بعد (سنہ ۷۰ میں) خود رومیوں ہی کے ایک اور گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں اس طرح عمل ہوا کہ نہ ہیکل رہا اور نہ ہیکل کے پجاری ۔ ۔ ۔ عذر لے جبرِ ہستاں بانحت ہی فطرت کی تعزیریں:

حضرت مسیحؑ جس قسم کا انقلاب لائے اس کی تفصیل قرآن کریم میں نہیں آئی۔ نہ ہی انجیل میں اس کی صراحت ملتی ہے البتہ ان دونوں میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے اس انقلاب کی ایک خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متبعین (حواریوں) نے آپ سے کہا کہ موجودہ نظام کی رو سے جو روٹی انسانوں کے ہاتھوں سے ملتی ہے وہ بڑی ذلت آمیز ہے۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ رزق خدا کے ہاں سے ملے تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کا دستِ نگر اور محکوم نہ رہے۔ اس پر انہیں "آسمانی رزق" ملنے لگا۔ اس "آسمانی رزق" کے اشارات، انجیل میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ انجیل متی (باب ۱۱ آیت ۲۸) میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت یہ تھی کہ:

اے محنت کشو! اے بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، تم سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دوں گا۔

دوسری طرف وہ سرمایہ داروں سے کہتے ہیں کہ

اپنے واسطے زمین پر مال و متاع جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا لگتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے ہیں اور چراتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھو! تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ (متی ۔ باب ۶ ۔ ۱۹)

اس کے لئے انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا، اس کا نقشہ کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ :

اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال ۲: ۴۴-۴۵)

دوسری جگہ ہے :-

اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں مشترک تھیں ..... اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال ۴: ۳۲-۳۵)

یہ تھا وہ اقتصادی نظام جسے جناب مسیح نے قائم فرمایا تھا۔

یہ تھیں اقوام سابقہ کی سرگزشتیں جنہیں قرآن کریم نے اپنی سب سے پہلی مخاطب قوم کے سامنے پیش کر کے ان سے کہا کہ یہ تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے وہ کھنڈرات بھی جن کے پاس سے تم اکثر گزرتے

قرآن کی مخاطب قوم

رہتے ہو۔ تم انہیں بنظر غائر دیکھو اور سوچو کہ یہ تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ جس قوم میں اس قسم کے جرائم پیدا ہوئے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ یہاں تک تو تم تاریخی شواہد سے دیکھ سکتے ہو۔ اب اس کے بعد تم اس حقیقت کو سن لو کہ یہ کچھ محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہو گیا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو پہلے بھی کارفرما تھا اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ (۳۳/۶۲)

خدا کی وہ روش جو اقوام سابقہ کے سلسلے میں کارفرما تھی، تو اس روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔

تمہارا نظام بھی اسی قسم کا تخریبی ہے جیسا ان اقوام کا تھا۔ اس لئے اگر تم نے اسے تبدیل نہ کیا تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان اقوام کا ہوا تھا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۔ (۳۴/۱۹) جس طرح وہ مٹ گئیں اور ان کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں اسی طرح تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری بھی فقط داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تم اپنے لئے کیا چاہتے ہو! شوکت و ثروت اور عزت و آبرو کی زندگی یا تباہی و بربادی کا ہولناک انجام! جن سعید نفوس نے اس پیغام کو بگوش ہوش سنا، انہوں نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح وہ بتدریج جماعت مومنین وجود میں آ گئی جس کا مقصد حیات ایسا نظام متشکل کرنا تھا جو مستقل اقدار خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور اس میں ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو جن کا نتیجہ قرآن نے امتوں کی ہلاکت بتایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہ نظام قائم کیا اور

جماعت مومنین

آسمان کی آنکھ نے جہاں یہ عبرتناک مناظر دیکھے تھے کہ غلط نظام کے ہاتھوں بڑی بڑی شوکت و سطوت کی مالک قومیں کس طرح راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح اس نے یہ درخشندہ و تابناک منظر بھی دیکھا کہ صحیح اقدار خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے سے کس طرح ایک ساربان اونٹ چرانے والی قوم چند ہی دنوں میں تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ اس قوم کے جلو میں کس طرح کارواں انسانیت رواں دواں اور شاداں و فرحاں اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھے چلا جاتا ہے، اس سکون و اطمینان کے ساتھ کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) نہ اس قافلہ کو بیرونی

خطرات کا کوئی خوف ستاتا ہے اور نہ ہی افرادِ کارواں کے لئے قلبی حزن و ملال وجہِ افسردگی اور موجبِ پریشانی بنتا ہے — طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۔

اس جماعت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو ہر وقت سامنے رکھیں اور اس کی جانچ پڑتال کرتے رہیں کہ ان میں کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہونے پائے جو قوموں کی تباہی کا موجب بنا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند ایک بنیادی اصولوں کو بھی یاد رکھیں۔ مثلاً:

اصولِ حیات

(۱) تمہیں یہ مقام جسے استخلاف فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان اور عمل کے نتیجہ میں ملا ہے (۲۴)۔ ایمان کے معنی ہیں مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم۔ اور عمل کے معنی ہیں ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل۔ جب تک تمہاری یہ کیفیت رہے گی تمہارا بلند و بالا مقام قائم و دائم رہے گا۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) جو مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ اس سے کبھی نہیں چھنتا جب تک وہ اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے جو اسے اس مقام کا اہل نہ رہنے دے۔ نفسیاتی تبدیلی تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اس لئے اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر واقع نہ ہونے پائے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائے۔

(۳) اپنے ہاں معاشی نظام اسی قسم کا رائج رکھنا جس میں ذرائع پیداوار اور مال و دولت ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کیلئے کھلے رہیں۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے اس قسم کے نظام سے اعراض برتا تو یاد رکھو تمہاری جگہ کوئی اور قوم آ جائے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ (۴۷/۳۸)

(۴) جب کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱/۱۱) ظلم کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن اس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس شے یا جس شخص کو جس جگہ ہونا چاہیے اسے وہاں نہ رکھنا۔ ظلم سے قوموں کی جڑ اس طرح کٹ جاتی ہے کہ خلقِ خدا ان کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۶/۴۵)

(۵) اور سب سے آخر یہ کہ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری رہے گی۔ تم باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہو اور اس مقصد کے لئے تمہیں جان تک بھی دینی پڑے تو بلا تامل و توقف دے دو۔ اگر دنیاوی جاذبیتوں نے تمہارا راستہ روک لیا اور تم نے جہاد سے گریز کیا تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۔ (۹/۳۹) تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ تھے وہ اصول و ضوابط جو خدا نے اس قوم کو دیئے جس نے خدا کے نام پر مملکت قائم کی۔

اور وہاں سے آگے بڑھ کر آپ اس قوم کی طرف آ جائیے جس نے تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر خدا کے نام پر قائم کرنے کے لئے ایک مملکت

ملتِ پاکستانیہ

کا مطالبہ کیا اور اسے وہ مملکت عطا کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت اور اس کی حامل قوم کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس قوم کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قوموں کے عروج و زوال سے متعلق قوانینِ خداوندی اٹل ہیں۔ انہی کے مطابق اقوامِ سابقہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوا تھا انہی کی رو سے ہمارے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ اس لئے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۔ اقوامِ سابقہ کے سامنے تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳/۱۳۶) تم دنیا میں چلو پھرو اور

نگہ بصیرت سے دیکھو کہ جن اقوام نے ان قوانین کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ حقیقت کسی خاص قوم، خاص زمانے یا خاص مقام تک محدود نہیں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ یہ تو عالمگیر انسانیت کے لئے واضح حقیقت ہے وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ دنیا کی جو قوم بھی چاہے کہ وہ ان خطرات سے محفوظ رہے جن سے اقوام سابقہ دوچار ہو کر تباہ ہوئی تھیں تو وہ ان کے احوال و کوائف سے عبرت اور ان قوانین سے راہ نمائی حاصل کرے۔

لہٰذا ہمیں دیکھنا ۔ ۔ ۔ یہ ہے کہ وہ کونسی خرابیاں تھیں جو اقوام سابقہ کی تباہی کا موجب بنیں۔ اور پھر اس کا جائزہ لینا کہ وہ خرابیاں ہمارے ہاں تو نہیں پیدا ہو گئیں۔ یہ خرابیاں 'قوم بہ قوم' گنائی جا چکی ہیں لیکن چونکہ ہم کافی لمبی مسافت طے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس سفر کے بعض سنگ میل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہوں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان خرابیوں کی مختصر سی فہرست ایکبار پھر سامنے لے آئی جائے تاکہ اس سے تجدید یادداشت ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کو اچھی طرح سامنے رکھنے کہ بنیادی جرم تو دراصل ایک ہی ہے جس سے قوموں کی تباہی ہوتی ہے یعنی وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار سے بے اعتنائی برتنا اور معاشرہ کا نظام اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے مطابق متشکل کرنا۔ باقی جرائم اسی اصل کی مختلف شاخیں ہیں لیکن چونکہ وہ جرائم نمایاں اور محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اس لئے انکے تذکرہ سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اب ان جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمایئے جن کی وجہ سے اقوام سابقہ تباہ ہوئی تھیں۔

تباہ کن جرائم کی فہرست

(۱) جب کسی معاشرہ میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت اور دستکاری سے روٹی کمانیوالوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ قوم نوح کے ساتھ ہوا۔

(۲) جب قومیت کا معیار، ایمان یا نظریۂ حیات کے اشتراک کے بجائے، رنگ، نسل، وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو اس کا نتیجہ بھی تباہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے سامنے آتی ہے۔

(۳) جو قوم جبر و قہر سے حکومت کرے اور دوسروں کی محنت کی کمائی کا استحصال (EXPLOITATION) اس کا شعار ہو وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی خواہ وہ تمدن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی ہو اور علوم و سائنس میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قوم عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

(۴) جس معاشی نظام میں ذرائع پیداوار ۔ یعنی زمین اور اسکے متعلقات ۔ پر ذاتی ملکیت جائز قرار دیدی جائے اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کیلئے کھلی نہ رہنے دی جائے، اس نظام اور اسکی حامل قوم کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قوم ثمود کی سرگزشت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

(۵) جس قوم کا کاروبار سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو یعنی اس میں سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہو کہ وہ محنت کشوں کو جو جی میں آئے دے اور صارفین (CONSUMERS) سے جتنا جی چاہے وصول کرے، وہ ناپ اور تول کے پیمانے اپنی منفعت اور مصلحت کے مطابق رکھے اور اس پر اس سے بازپرس کرنیوالا کوئی نہ ہو، وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت قوم شعیبؑ کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۶) اور اسی قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت بھی کہ جب مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ تک محدود کر دیا جائے اور اسکی ہر ایک کو آزادی ہو لیکن کاروباری معاملات میں اسے دخل نہ دینے دیا جائے یعنی جہاں نظام سیکولر ہو، وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

(۷) اور قوم لوط کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم میں جنسی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور جنسی بدنہادی کو عام ہونے دیا جائے اس قوم کی کشتی بحر میت میں ڈوب جاتی ہے۔

(۸) قوم فرعون کے انجام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس قوم کی سیاست میں بنیادی نظریہ پیدا ہو جائیں وہ قوم غرق ہو جاتی ہے۔ اندازِ ملوکیت کی ابھری ہوئی خصوصیات یہ نہیں کہ اس میں حکمرانی قانون کی نہیں ہوتی، ایک فرد یا افراد کے مجموعے کے فیصلوں کی ہوتی ہے۔ اس میں قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا

جاتا ہے اور پھر پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر انکی اجتماعی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے۔ سیاست میں ان لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے جن میں جوہرِ مردانگی نہ ہو اس لئے وہ ہمیشہ ہیئتِ حاکمہ کے تابع فرمان ہیں جن لوگوں میں ذرہ برابر بھی غیرت و حمیت کے آثار نمودار ہوں انہیں کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔

نیز اس نظام میں رزق کے سرچشمے، قوم کی تحویل میں رہنے کے بجائے ہیئتِ حاکمہ کی ذاتی ملکیت متصور ہوتے ہیں اور اس طرح یہ حکمران طبقہ، قوم کا اَن داتا بن کر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔ اس مقصد کیلئے یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اپنے حریفوں کو ان کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر انہیں ختم کر کے رکھ دے۔

(۹) قوم بنی اسرائیل گویا ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی، ربوا اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر استوار تھا۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ ان کا نظام کیپٹل ازم اور تھیاکریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقے سے چاہیں دولت سمیٹتے چلے جائیں، بشرطیکہ وہ صدقے اور خیرات کے کاموں میں چندہ دیدیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں۔ ان کے لیڈروں کی حالت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کر کے کچھ نہ دکھائیں بلکہ محض بیان بازی کے زور پر پاپولیرٹی (POPULARITY) حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشوائیوں کا تعلق ہے، مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعہ معاش۔ وہ اپنے جی سے شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے امام ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عاید کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی سازباز تھی اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستے میں حائل ہے، اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر کے، اس کی موت کے احکام صادر کرا لیتے۔ یہ تھے اس قوم کے کبیرہ جرائم جن کا نتیجہ ان کی ایسی تباہی تھی جو دنیا میں ضرب المثل بن کر رہ گئی۔ اس قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۰)

باز بخویشتن نگر

یہ ہے ان جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے اقوامِ سابقہ اپنے اپنے وقت میں تباہ و برباد ہوئیں۔ ان کی سرگزشتوں کو قرآن کریم نے اسلئے بیان کیا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم خود فیصلہ کریں کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقائق اس قدر واضح اور یہ معیار اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ اس کی موجودگی میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں اور ہماری حالت بالکل بے نقاب۔ آپ سوچیئے کہ قوموں کو تباہ کرنے والے جرائم کی جو فہرست قرآن کریم نے پیش کی ہے، ان میں کوئی ایک جرم بھی ایسا ہے جو ہمارے معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو اور اس کے بعد سوچیئے کہ اگر ہماری حالت یہی ہے اور ہم اپنے موجودہ نظام کو نہ بدلیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں تباہ ہونے سے بچا سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے بہی خواہانِ ملت قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے مختلف طریقے سوچ رہے ہیں لیکن معاف فرمایئے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان سب کی نگاہ علاماتِ مرض پر ہے، علتِ مرض پر نہیں، ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اگر ہم زیادہ سے زیادہ عسکری قوت حاصل کر لیں تو پھر ہم ہر طرح سے محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عسکری قوت، قوموں کی حفاظت اور بقا کے لئے لاینفک ہے اور اسکے فراہم کرنے کی قرآن بڑی تاکید کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عسکری قوت کو اگر حدودِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو خود وہی قوت قوم کو تباہ کرنے کا موجب بن جایا کرتی ہے۔ دیکھیئے وہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کیسے واشگاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کہہ کہ ان سے کہدو کہ ذرا تاریخی شواہد پر نگاہ ڈالو۔ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ۔ (۴۷/۱۳) کتنی قومیں ایسی تھیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ قوت

حاصل تھی لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کی قوت انکے کسی کام نہ آئی، وہ تباہ و برباد ہو گئیں اور کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔

بعض زور دیتے ہیں کہ یہ دور سائنسی ایجادات کا ہے اسلئے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ یہ دور سائنٹیفک ترقیوں کا ہو یا نہ ہو، قرآن کریم نے تو آج سے چودہ سو سال پہلے کہدیا تھا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا، وجہ امتیازِ آدمیت ہے۔ اسلئے سائنٹیفک ترقیاں ہمارا فریضہ ہے لیکن اگر سائنٹیفک ایجادات کو مستقل اقدار کے سواحل کا پابند نہ کیا جائے تو

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے   عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس نے کہا ہے کہ تم اقوامِ گذشتہ کے تاریخی نوشتوں کو دیکھو تمہیں ان میں ایسی ایسی قومیں نظر آئیں گی جنہیں سماعت، بصارت اور ذہن رسا کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶)۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کے علم و ہنر کی صلاحیتیں ان کے کسی کام نہ آئیں اور وہ انہیں اس تباہی سے ذرا بھی محفوظ نہ رکھ سکیں جس کے متعلق وہ کبھی (SERIOUSLY) سوچا نہیں کرتے تھے وہ ان قوانین و اقدار کو مذاق سمجھتے تھے۔ لیکن فیصلہ کن حقیقتیں وہی ثابت ہوئیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود مغربی محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیق و تفتیش کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔۔۔۔ شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف برفا لکھتا ہے:۔

> اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی ہے۔ ذہنی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کے تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ قوت، تہذیب، کلچر سب بے معنی ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (P. 259)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ روٹی کا ہے۔ اگر اسے حل کر لیا جائے تو تمام خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھوک خدا کا عذاب ہے اور رزق کی فراوانیاں اس کی نعمتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ اگر رزق کی فراوانیوں کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھا جائے تو وہی فراوانیاں معاشرہ کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸/۵۸)۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں لیکن اسکے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس طرح چراغ سحری بجھنے سے پہلے اور تیزی سے جگمگاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم کے ہلاکت کے دن قریب آ جاتے ہیں تو ان کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امڈ کر آ جاتی ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶/۴۴)۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم ان اقدار کو فراموش کر دیتی ہے جن کی انہیں اکثر یاد دہانی کرائی جاتی رہی ہے تو ان پر سامانِ زیست کے دہانے کھل جاتے ہیں اور جب وہ دولت و ثروت کی اس قدر فراوانیوں کی رو میں بہہ جاتے ہیں تو ان پر اچانک تباہی آ جاتی ہے۔ ایسی تباہی کہ انہیں بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا، قرآن کریم کی رو سے تنہا روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ قوموں کے لئے تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے وہ بنیادی اصول جس سے ہر آسمانی پیامبرِ انقلاب نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ یعنی اُعْبُدُوا اللّٰهَ۔ جس سے مراد یہ ہے کہ زندگی

کے ہر گوشے میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت کیجائے۔ جواب قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں جب ملّی ہیئتِ اجتماعیہ یعنی نظامِ معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ قوم ہر لحاظ سے اَعْلَوْن کے مقام پر پہنچ جاتی ہے یعنی دنیا کی کوئی قوم اس کی ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر وہ ان اقدار سے بے اعتنائی برتتی ہے تو سیاسی غلبہ، تسلط، عسکری قوت، حشمت یا معاشی فراوانی و فراخی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایک بار پھر بریفا کے الفاظ سنیئے۔ وہ کہتا ہے

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے (۱۹۵۹ء، ص ۲۲۳)

یہ ہے قرآنِ کریم کا آخری فیصلہ جس کی تائید خود مغرب کے ڈیوڈ ورمبی کر رہے ہیں۔ ہم نے قرآنِ کریم کی روشنی میں ان اقوام کی سرگزشتوں کا مطالعہ کر لیا ہے جو اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان اقوام میں اگر وہ کبائر الاثم ایک ایک دو دو کر کے ابھرتے تھے تو ہم ... میں وہ سب کے سب یکجا ہو چکے ہیں اور دن بدن زیادہ سے زیادہ پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں

واضح ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ صورتِ حالات بڑی مایوس کن ہے لیکن ابھی امید کی کچھ کرنیں باقی ہیں۔ قرآنِ کریم ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ان کی آخری شکل وہ ہوتی ہے جب تباہی محسوس طور پر اس قوم کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر وہ قوم اس سے پہلے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لے تو اس کے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آجائے تو پھر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ دیکھئے، سورۃ الانبیاء میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں (GRAPHICALLY) بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو اپنے اس نظام کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا تباہ ہو گئیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں انکی غلط روش کے تباہ کن مآل سے آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس سے ہمیں فروغ حاصل ہو رہا ہے اسلئے اس کا نتیجہ تباہی کیسے ہو سکتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسکے نتائج غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب یہ مدت ختم ہو گئی فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ يَرْكُضُوْنَ اور انکی تباہی محسوس شکل میں انکے سامنے آگئی تو وہ لگے بھاگنے لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا لَا تَرْكُضُوْا بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْــَٔـلُوْنَ چلو اپنے محلات کی طرف اور اس سامانِ تعیش کی طرف جو تم نے اس طرح فراہم کر رکھا تھا۔ چلو واپس تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اتنا مال و دولت کہاں سے لیا تھا۔ وہ مظلوم کون سے تھے جن کے خون کی رنگینی تمہارے محلات کیلئے وجہ آرائش و زیبائش بنی تھی۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ چنانچہ جب انہیں گرفتار کر کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم و استحصال سے حاصل کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۵) وہ یہ دہائی مچاتے رہے لیکن اس وقت اس پکار اور فریاد نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا اور وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت ہو یا بجھا ہوا شعلہ۔

لہٰذا جس قلبِ حساس میں پاکستان کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس میں موجزن، اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ معاشرہ کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جائے گی بلکہ عزت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائیگی جہاں سے انسان اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر دیکھا کرتا ہے۔ لیکن اگر ان سے اعراض برتا گیا تو ہماری تباہی یقینی ہے یہی خدا کی سنتِ مستمرہ ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ اور سنت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔ یاد رکھیئے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

(پرویز۔ سنہ ۱۹۷۱ء)